محمد سعید *

سعادت حسن منٹو کا ایک غیر مدوّن نادر ترجمہ

منٹو نے ابتدا میں زیادہ تر روسی اور فرانسیسی ادب سے تراجم کیے لیکن اُن کے اسی ابتدائی دور کا ایک نادر ترجمہ ملا جو ''دست بریدہ بھوت'' کے عنوان سے شائع ہوا (۱) اور اب تک اُن کے کسی مجموعے یا کلیات میں شامل نہیں ہو سکا۔ اس ترجمے کی ایک اہمیت تو یہ کہ منٹو کی زندگی میں یا اس کے بعد بھی اُن کے کسی مجموعے میں شامل ہے نہ کسی کلیات میں اس کے بارے میں منٹو کے کسی نقاد یا محقق نے کبھی ذکر کیا ہے۔ اس طرح اس کا شمار منٹو کے نوادرات میں ہوتا ہے۔ دوسرا یہ کہ بالعموم اس دور میں منٹو نے اپنے اُس وقت کے ادبی عقائد اور اپنی ذہنی پرورش کے زیر اثر زیادہ فرانسیسی اور روسی ادب سے تراجم کیے لیکن اس کے برعکس یہ ایک انگریز مصنف کے ''سحر انگیز'' افسانے کا ترجمہ ہے۔ اس ترجمے کا ذکر صرف ابوسعید قریشی نے ان الفاظ میں کیا ہے:

> منٹو کی تخلیقی کاوشوں کی ابتدا ترجموں سے ہوئی۔ پہلا ترجمہ (جہاں تک مجھے یاد ہے) ایک پُراسرار طویل افسانہ دست بریدہ بھوت تھا۔ اپنی قسم کا یہ پہلا اور آخری ترجمہ اور تجربہ تھا۔ (۲)

منٹو کا پہلا مطبوعہ ترجمہ تو اسے نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس سے پہلے ۱۹۳۳ء میں سرگذشتِ اسیر کے نام سے وکٹر ہیوگو کے پورے ناول کا ترجمہ جو منٹو نے کیا وہ چھپ چکا تھا۔

اس کے علاوہ ''دست بریدہ بھوت'' سے پہلے رسالہ ہمایوں ہی میں منٹو کے ''جادوگر''، ''شیطان اور شراب''، ''سپاہی اور موت'' اور ''چھبیس مزدور اور ایک دوشیزہ'' کے عنوانات سے مختلف ترجمے چھپ چکے تھے۔ ابوسعید قریشی منٹو کے بچپن کے دوست تھے اور منٹو کے اس ترجمہ نگاری کے دور میں اُن کے قریب بھی تھے۔ ہوسکتا ہے اُن کی یادداشت کے مطابق منٹو کا یہ پہلا ترجمہ ہو لیکن اس کی اشاعت بعد میں ہوئی ہو۔

منٹو کے اس ترجمے کے آخر میں لکھا ہے ''ماخوذ از کانن ڈائل'' جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ منٹو نے کانن ڈائل کے افسانے کا لفظی ترجمہ نہیں کیا بلکہ کہانی اُن کے افسانے سے اخذ کی ہے۔ اصل افسانے سے موازنہ کرنے پر پتا چلتا ہے کہ منٹو نے نہ صرف یہ کہ ترجمے میں کرداروں کے نام مقامی مسلمانوں کے رکھ لیے اور ماحول اور فضا ہندوستانی پیش کی بلکہ اصل افسانے کی بہت ساری تفصیلات جو مقامی ماحول سے تعلق نہیں رکھتی تھیں اُن کو حذف بھی کیا۔ خصوصاً منظر نگاری افسانے میں جہاں جہاں بھی ہے منٹو نے حذف کر دی ہے۔ اصل افسانہ طویل ہے اور تقریباً بارہ پندرہ صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ جبکہ منٹو کا ترجمہ رسالے کے تقریباً آٹھ صفحات پر مشتمل ہے۔

سر آرتھر کانن ڈوئیل (Sir Arthur Conan Doyle) سکاٹ لینڈ میں ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے اور ۱۹۳۰ء میں انگلینڈ میں وفات پائی۔ وہ پیشے کے لحاظ سے ڈاکٹر تھے لیکن انگریزی ادب میں ان کی شہرت بہ طور ناول نگار، افسانہ نگار اور شاعر کے ہے۔ ان کے افسانوں کی سیریز ''Sherlock Holmes'' کو خاص شہرت حاصل ہے۔ ان کے ایک افسانے ''The Brown Hand'' کو منٹو نے ''دست بریدہ بھوت'' کے نام سے ترجمہ کیا۔ اصل افسانے میں تین اہم کردار ہیں: ایک ڈاکٹر، دوسرا اس کا دور کا ایک رشتہ دار اور تیسرا بھوت ہے۔ بھوت ایک پختون مریض ہے۔ جو زخمی ہاتھ لے کر ڈاکٹر کے پاس آتا ہے۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ ہاتھ کاٹنا پڑے گا ورنہ تمہاری زندگی کو خطرہ ہے۔ مریض کہتا ہے کہ میرے مذہب میں یہ جائز نہیں مگر بالآخر جان بچانے کے لیے راضی ہو جاتا ہے۔ ڈاکٹر اس سے کوئی فیس نہیں لیتا اور بدلے میں اُس کا ہاتھ اپنی تجربہ گاہ میں رکھنا چاہتا ہے۔ مریض اس شرط

پر راضی ہو جاتا ہے کہ اُس کا ہاتھ محفوظ رکھا جائے گا۔ کچھ عرصے بعد ڈاکٹر کے گھر آگ لگتی ہے اور باقی سامان کے ساتھ اس کا ہاتھ بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ اس دوران میں وہ مریض بھی فوت ہو چکا ہے اور اب بھوت بن کر ڈاکٹر سے اپنا ہاتھ واپس لینے کا تقاضا کرتا رہتا ہے۔ ڈاکٹر کا وہ رشتہ دار بھی مافوق الفطرت واقعات سے دلچسپی رکھتا ہے اور اس مشکل سے اسے نکالنے پر غور کرتا ہے۔ وہ کسی ہسپتال سے ایک مردے کا ہاتھ کٹوا کر لے آتا ہے اور مرتبان میں سجا دیتا ہے۔ بھوت حسبِ معمول آتا ہے اور اسے اپنا ہاتھ سمجھ کر اٹھا لیتا ہے اور اُن سے خوش ہو جاتا ہے۔ اس طرح اُس ڈاکٹر کو اس بھوت سے نجات مل جاتی ہے۔

دست بریدہ بھوت

اس بات کا سب کو علم ہے کہ مشہور ہندوستانی ڈاکٹر رستم خاں نے مجھے اپنا متبنّٰے قرار دیا اور میں اُن کی وفات کے صرف ایک گھنٹے بعد غریب اور محنتی دوا فروش سے ایک متموّل انسان بن گیا۔ بعض حضرات صاحبِ موصوف کے اس فعل کو دیوانگی تصوّر کرتے ہیں کیونکہ مجھ ایسے دُور کے رشتہ دار کے علاوہ کئی ایسے افراد تھے جو اُس دولت کے مالک بن سکتے تھے۔ مگر میں یقین دِلا سکتا ہوں کہ یہ فعل کسی دیوانگی کا نتیجہ نہ تھا اور یہ بھی یقین دلا سکتا ہوں کہ مجھے ڈاکٹر صاحب سے اُن کی زندگی کے آخری ایام میں ملاقات کرنے کا موقع ملا، اور بعض ایسی وجوہ تھیں جن کی بنا پر اُنہوں نے مجھے اپنی دولت کا واحد مالک قرار دیا۔ اگر میں خود اپنے مُنہ سے اِن وجوہ کو بیان کروں تو شاید آپ اُسے اپنے مُنہ میاں مٹھو بننے کے مرادف خیال کریں گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ میں نے ڈاکٹر صاحب کے لیے جو خدمات انجام دیں وہ ہر شخص سے ممکن نہ تھیں۔ اور ان سے آپ کو آگاہ کرانا میرا فرض ہے کیونکہ شاید اس طرح ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ ہو جائے۔ میری باتوں پر یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کی مرضی پر منحصر ہے۔

سر رستم خاں۔ سی، بی، کے، سی، ایس، آئی اور خدا معلوم کیا کیا کچھ، ہندوستان میں اپنے زمانے کے بہترین جرّاح اور ڈاکٹر مانے گئے تھے۔ وہ کلکتہ میں دیر تک سرکاری ملازم کی حیثیت سے کام کرتے رہے تھے، اور

اور مینٹل ہاسپٹل کی بنیاد بھی انہی کے مساعیٔ جمیلہ کی مرہونِ منت ہے۔

شب و روز کی متواتر محنت و مشقت کے بعد ایک ایسا دن آیا جب اُنہیں معلوم ہوا کہ وہ اب اپنے کام اور طبی تحقیق کو جاری نہیں رکھ سکتے چنانچہ زندگی کے باقی ماندہ ایام کو آرام سے گزارنے کی خاطر اُنہوں نے کلکتے کو خیر باد کہی اور اپنے وطن مالوف بمبئی کو روانہ ہو گئے۔

بمبئی پہنچ کر اُنہوں نے اپنی سکونت کے لیے باندرے کے قریب ایک کشادہ کوٹھی خرید لی جہاں وہ اپنا بیشتر وقت مطالعہ میں صرف کرنے لگے۔

اپنے متموّل اور بے اولاد رشتے دار کی آمد کی خبر ہمارے کنبہ بھر کے لئے ایک دلچسپ خبر تھی۔ اُن دعوت ناموں سے جو ڈاکٹر صاحب نے اپنے مختلف رشتے داروں کے نام بھیجے ہم پر یہ بات روشن ہوگئی کہ اُن کے دل میں ہماری یاد ابھی تک باقی ہے۔

گو سب سے آخر مجھ کو طلب کیا گیا جس کا مجھے قدرتی طور پر رنج تھا مگر چونکہ ڈاکٹر صاحب کو رنجیدہ کرنا مقصود نہ تھا اور مجھے بھی اُن سے ملنے کا اشتیاق تھا میں اپنی بیوی سے اجازت لے کر اُن کی خدمت میں روانہ ہو گیا۔

گاڑی میں ایک گھنٹے کے سفر کے بعد میں اپنے چچا کے مکان پر پہنچ گیا۔ اُن کا خادم مجھے مطالعہ کے کمرے میں لے گیا جہاں وہ انگیٹھی کے قریب ایک صوفے پر بیٹھے اُونگھ رہے تھے۔

کمرے میں کسی کی آہٹ پا کر وہ یکلخت چونک پڑے اور میرا گرمجوشی کے ساتھ استقبال کیا—— اُن دو بڑی بڑی سیاہ آنکھوں سے جو مجھے دیکھ رہی تھیں یہی معلوم ہوتا تھا گویا وہ میرے سینے کے اندر داخل ہو کر میرا جائزہ لے رہی ہیں۔

اُن کے جسم سے، جو اب محض ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا، یہ اندازہ کیا جا سکتا تھا کہ وہ کسی زمانہ میں قوی الجثّہ ہوں گے۔ اُن کی غیر معمولی مضطرب نگاہوں سے یہ پتہ چلتا تھا کہ اُن کی زندگی سے کوئی ایسا اہم واقعہ ضرور متعلق ہے جس نے اُن پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے اور اُن کے جسم کو آہستہ آہستہ دیمک کی طرح چاٹ رہا ہے۔

چچا کے استقبال کی گرمجوشی نے مجھے ایک گھنٹے کے عرصے کے اندر اندر ہی اُن سے بے تکلف کر دیا۔ کھانے میں اُن کی بیوی بھی ہمارے ساتھ شریک ہوئیں۔

اُن کی بیوی کی نگاہوں میں بھی اضطراب کی وہی لہر جھلکیاں لے رہی تھی—— میں سخت متعجب تھا کہ وہ

کونسا ایسا اہم واقعہ ہو سکتا ہے جس نے ان دونوں کو یکساں مضطرب کر رکھا ہے؟

باتوں باتوں میں مافوق الفطرت قصوں کا ذِکر آ گیا۔ چونکہ مجھے ایسی باتوں سے نفسیات کا ایک طالب علم ہونے کی وجہ سے گہری دلچسپی تھی، میں نے اُن سے وہ واقعات بیان کیے جن میں مجھے اکثر اوقات مافوق الفطرت اشیا سے دوچار ہونا پڑا تھا۔ جب میں نے اُن سے یہ بیان کیا کہ ایسے محیّر العقول واقعات مجھے خوفزدہ کرنے کے بجائے ایک دلچسپی کا سامان مہیا کرتے ہیں تو وہ میری گفتگو کو بڑی توجہ سے سننے لگے۔

گفتگو کے دوران میں ڈاکٹر صاحب نے کئی بار اپنی بیوی کی طرف پُرمعنی نگاہوں سے دیکھا مگر میں اس کا صحیح مطلب سمجھنے سے قاصر رہا۔

جب ڈاکٹر صاحب کی بیوی اُٹھ کر دوسرے کمرے میں چلی گئیں تو اُنھوں نے مجھے ایک سگرٹ پیش کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر نیاز! گو مجھے آپ سے بہت کم گفتگو کرنے کا موقع ملا ہے۔ مگر مجھے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہی وہ شخص ہیں جس کی مجھے ایک عرصے سے تلاش تھی''۔

میں نے اپنے چچا کے یہ تعریفی الفاظ سُن کر کہا۔ ''یہ آپ کا حُسنِ ظن ہے''۔

''اگر میں یہ کہوں کہ آپ ایک قوی دل کے مالک ہیں تو اس کو خوشامد سے تعبیر نہ کیجیے گا کیونکہ اس قسم کے تکلفات ایسے نازک موقع پر استعمال نہیں کیے جا سکتے—— ہاں! تو چونکہ آپ کو ایسی چیزوں سے لگاؤ ہے اور آپ اُن کا فلسفیانہ نقطۂ نگاہ سے مطالعہ کیا کرتے ہیں۔ کیا میں یہ خیال کر سکتا ہوں کہ کوئی بھوت یا آوارہ روح آپ کو خوفزدہ نہیں کر سکتی؟''

''میرا خیال تو یہی ہے جناب!''

''بلکہ وہ نظارہ آپ کے لیے دلچسپ ہوگا''۔

''بڑی حد تک''۔

اس پر اُنھوں نے ایک لمبی آہ بھری۔

''مسٹر نیاز! یقین کیجیے گا، ایک وقت تھا جب میں بھی آپ کی طرح کسی چیز سے خائف نہ ہوتا تھا۔ قوی دِل ہونے کے باعث میں کلکتہ بھر میں مشہور تھا—— مگر اب میں وہ نہیں رہا۔ خدا کے لیے اس معاملے میں جرأت سے کام نہ لیجیے، ورنہ مجھے اندیشہ ہے کہ آپ کو وہی کڑا امتحان دینا پڑے گا جس نے آج کل مجھے عاجز کر رکھا ہے——

ایسا امتحان جس کا انجام پاگل خانہ یا قبر کی چار دیواری ہے!''

تھوڑی دیر ٹھہرنے کے بعد وہ اپنی گفتگو جاری رکھتے ہوئے بولے۔'' چند سال سے ایک مہیب اور ناقابل تسلیم واقعے نے میری اور میری بیوی کی زندگی کو عذاب بنا رکھا ہے۔ گو وہ واقعہ ہر روز پیش آتا ہے لیکن اُس کا اعادہ ہماری تاب برداشت میں اضافہ نہیں کر سکا۔ اگر آپ کو کوئی چیز خوفزدہ نہیں کر سکتی تو میں اس معاملے میں آپ کی رائے کو بہت قیمتی خیال کروں گا''۔

'' میری ناچیز رائے ہر وقت آپ کے لیے حاضر ہے مگر مجھے معاملے کی نوعیت تو معلوم ہونی چاہیئے؟''

میرا اشتیاق حد سے زیادہ بڑھ چکا تھا۔

''اس واقعے کی تفصیلات سننے سے پیشتر کیا آپ میرے ساتھ دوسرے کمرے تک چلنے کی تکلیف گوارہ فرما سکتے ہیں؟''

یہ کہتے ہوئے وہ مجھے دارالتجربہ میں لے گئے جو لاتعداد آلاتِ جراحی اور بے شمار بوتلوں سے بھرا پڑا تھا۔ ایک میز پر شیشے کے مرتبان، جن میں مختلف قسم کے حیوانی اعضا محفوظ تھے، ایک قطار میں سجے ہوئے تھے۔

'' مرتبانوں کی قطار دیکھی آپ نے؟ — یہ اُس قیمتی مجموعے میں سے صرف چند ہیں جو خوش قسمتی سے میرے کلکتے کے مکان کی آتشزدگی کے بعد باقی بچ گئے تھے۔ یہ نقصان ہر طرح میرے لیے ناقابل تلافی ثابت ہوا ہے''۔

میں نے اُن مرتبانوں کی طرف دوبارہ دیکھا تو معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے جمع کردہ اعضا، کیڑے مکوڑے اور مختلف اقسام کی ہڈیاں جو مرتبانوں میں بڑی نفاست سے محفوظ رکھی تھیں، واقعی بیش قیمت ہیں۔

تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلنے کے بعد ڈاکٹر صاحب مجھ سے مخاطب ہوئے۔'' میں بہت ممنون ہوں گا اگر آپ آج کی رات اسی کمرے میں قیام فرمائیں — اور اگر آپ کسی وجہ سے ایسا نہیں کر سکتے تو بلا تامل مجھ سے کہہ دیجیے''۔

مجھے کیا عذر ہو سکتا تھا۔ چنانچہ میں نے فوراً ہی کہا۔''اس کے بالکل برعکس! میں بالکل تیار ہوں''۔

'' میرا کمرہ آپ کے دائیں طرف ہے، اگر آپ کو کسی وقت میری ضرورت محسوس ہو تو میں صرف ایک آواز پر حاضر ہو جاؤں گا''۔

میں نے اپنے چچا کو مطمئن کرتے ہوئے کہا۔'' مجھے یقین ہے میں آپ کو ہرگز ایسی تکلیف نہ دوں گا''۔

'' مگر یہ ناممکن ہے کہ مجھے نیند آ جائے — میں بہت کم سوتا ہوں۔ اس لیے ضرورت کے وقت مجھے بُلانے میں تامل نہ کیجیے گا''۔

یہ تاکید کر کے ڈاکٹر صاحب اپنے کمرے میں چلے گئے۔ یہ کمرہ یعنی ڈاکٹر صاحب کا دارالتجربہ کسی طرح بھی سونے کے لیے موزوں نہ تھا۔ قسم قسم کی بوتلیں، مرتبانوں کی قطار جن میں خدا معلوم کن کن حیوانوں کے اعضا رکھے تھے، سپرٹ اور دیگر ادویہ کی تیز بُو فضا کو بہت مکدّر بنا رہی تھی۔ کھڑکی پر کوئی پردہ نہ تھا اس لیے چاند کی سیمیں کرنیں آزادانہ کمرے کی دیوار پر پڑ رہی تھیں۔

میں نے لیمپ کو گُل کر دیا کیونکہ چاند کی روشنی کمرے کے لیے کافی تھی۔ اب کمرے میں مکمل سکوت طاری تھا۔ میں نے شب خوابی کا لباس پہنا اور کسی حادثے کی توقع سے خالی الذہن ہو کر سوفے پر لیٹتے ہی سو گیا۔

کمرے میں کسی کی آہٹ سُن کر بیدار ہوا۔ مجھے سوتے ہوئے غالباً تین چار گھنٹے ہو گئے تھے کیونکہ چاند کی روشنی کا وہ دھبا جو دیوار پر تھا اب وہاں سے ہٹ کر میرے سوفے کے قریب پہنچ گیا تھا۔ میں نے اُس آہٹ کی جستجو میں کمرے کے چاروں طرف نگاہیں دوڑائیں مگر تاریکی کی وجہ سے مجھے کچھ نظر نہ آیا۔ آہستہ آہستہ جب میری نظریں تاریکی کی عادی ہو گئیں تو میرے بدن میں خوف کی ایک سرد لہر دوڑ گئی جب میں نے کسی چیز کو کمرے میں حرکت کرتے ہوئے دیکھا۔ اس چیز کے چلنے سے ایک مدّھم شور پیدا ہو رہا تھا جو فضا کو اور بھی بھیانک بنا رہا تھا —!

وہ چیز ایک انسانی جسم تھا جو دروازے کی جانب سے کمرے میں دبے پاؤں چلا آ رہا تھا۔

جب وہ سایہ نما انسان چاند کی روشنی کے درمیان آیا تو مجھے معلوم ہوا کہ وہ ایک متوسط قد کا آدمی ہے جو سر سے پیر تک ایک سپید لبادہ اوڑھے ہوئے ہے۔

چاند کی روشنی میں اُس کا چہرہ ایک مہیب منظر پیش کر رہا تھا۔

وہ ان مرتبانوں کی طرف آہستہ آہستہ بڑھا جن میں مختلف قسم کے انسانی اعضا پڑے ہوئے تھے۔ وہاں پہنچ کر اُس نے میری طرف نگاہیں اُٹھائیں، تھوڑی دیر ٹھہرا اور ناامیدی سے اپنے ہاتھ اوپر کی طرف اُٹھائے نظروں سے غائب ہو گیا —

ہاتھ نہیں بلکہ کہنا چاہیے کہ بازو اوپر کی طرف اُٹھائے کیونکہ اس حالت میں میں نے اُس کے بائیں

ہاتھ کو اپنی جگہ سے غائب پایا۔ چونکہ میں نے اُس نظارے کا خود اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کیا تھا اور اُس شخص میں کوئی ایسی چیز موجود نہ تھی جو خلافِ فطرت ہو اس لیے پہلے پہل میں نے یہی خیال کیا کہ شاید ڈاکٹر صاحب کا خادم ہوگا جو غلطی سے اُس کمرے میں چلا آیا ہے۔ مگر جب وہ یکا یک میری نظروں سے غائب ہو گیا تو میں فوراً اپنی جگہ سے اُچھلا اور لیمپ جلا کر تمام کمرے کو چھان مارا۔ جب اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا تو قدرتی طور پر مجھے یہ یقین ہو گیا کہ اُس شخص کی پُراسرار گمشدگی واقعی غیر فطری اور عقلِ انسانی کی حدود سے باہر ہے۔

میں نے شب کا باقی حصّہ جاگتے ہوئے کاٹا لیکن اس قسم کا کوئی واقعہ پھر پیش نہ آیا۔

میں صبح جلد بیدار ہونے کا عادی ہوں لیکن مجھے معلوم ہوا کہ ڈاکٹر صاحب مجھ سے کہیں زیادہ سحر خیز تھے۔ کیونکہ وہ علی الصبح ہی صحن میں پورا لباس پہنے ٹہل رہے تھے۔ مجھے دیکھتے ہی بھاگے ہوئے آئے اور کہنے لگے۔

''ہاں! بتائیے کیا آپ نے اُسے دیکھا؟''

''ایک ہاتھ والے انسان کو؟''

ڈاکٹر صاحب نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا ''ہاں اُسی کو''۔

''جی ہاں میں نے اُس شخص کو اچھی طرح دیکھا ہے'' اور یہ کہنے کے بعد میں نے رات والا واقعہ من و عن بیان کر دیا۔ جب میں اپنی کہانی سُنا چکا تو وہ مجھے اپنے مطالعے کے کمرے میں لے گئے اور مجھے کرسی پیش کرتے ہوئے بولے۔

''قبل اس کے کہ اس محیر العقول واقعے کی تفصیلات بیان کی جائیں مجھے اُمید ہے کہ آپ پر وہ وجوہ روشن ہو گئی ہوں گی جو میرے ذہنی تلاطم اور جسمانی کمزوری کا باعث ہیں۔ ہر روز اس شخص کا یہی مشغلہ ہے ——دروازے کے قریب سے ظاہر ہوتا ہے، میرے کاندھوں کو پکڑ کر زور سے ہلاتا ہے اور پھر مرتبانوں کی قطار کے پاس جا کر نظروں سے غائب ہو جاتا ہے''۔

میں نے حیران ہو کر کہا۔ ''لیکن آخر یہ چاہتا کیا ہے؟''

''اپنا کٹا ہوا ہاتھ''

''ہاتھ؟''

''ہاں! ہاں! اپنا ہاتھ —— واقعہ یوں ہے کہ کلکتہ میں میرے پاس ایک مریض آیا جس کا ہاتھ بُری طرح

زخمی ہو رہا تھا۔ چونکہ اُس کا علاج ناممکنات میں سے تھا اور یہ اندیشہ تھا کہ کہیں وہ زخم بڑھ کر دوسرے اعضا کو بھی نقصان نہ پہنچائے، میں نے اُس سے کہا۔ دیکھو بھئی! بہتر یہی ہے کہ تم بہ رضا و رغبت اپنا ہاتھ کٹوا ڈالو —— بہت سمجھانے بجھانے کے بعد وہ راضی ہو گیا۔

عمل جراحی کے بعد اُس نے مجھ سے میری فیس کے متعلق سوال کیا۔ بے چارہ بالکل فقیر سا معلوم ہوتا تھا۔ میں نے اُس سے مذاق کرتے ہوئے کہا کہ میری فیس تمہارا ہاتھ ہے جسے میں اپنے دارالتجربہ کی ایک بوتل میں بند کر رکھوں گا۔ یہ سُن کر وہ بہت سٹپٹایا اور کہنے لگا۔ مذہب ہمیں بتاتا ہے کہ قیامت کو جسم دوبارہ زندہ کیا جائے گا۔ اس لیے میرا کٹا ہوا ہاتھ میرے پاس رہنا ضروری ہے۔ اس پر میں نے اُسے ہاتھ دکھایا اور پوچھا کہ تم اُسے کس طرح حفاظت سے رکھ سکو گے۔ تمہارے پاس تو ایسی دوائیں ہی نہیں۔ چنانچہ بہت بحث مباحثے کے بعد وہ اپنا ہاتھ اس شرط پر میرے پاس چھوڑ گیا کہ میں اُسے انتہائی حفاظت سے رکھوں گا —— وہ شخص چلا گیا اور تھوڑے عرصے کے بعد ہی یہ معاملہ میرے ذہن سے اُتر گیا۔ اس شخص پر عمل جراحی کرنے کے چند ماہ بعد میرے مکان کو آگ لگ گئی جس میں اور بیش بہا چیزوں کے علاوہ وہ مرتبان بھی ضائع ہو گیا جس میں اُس کا ہاتھ محفوظ رکھا گیا تھا —— پہلے پہل تو مجھے اس ہاتھ کے ضائع ہونے کا خیال بھی نہ آیا مگر ایک برس بعد میں اپنے کمرے میں سو رہا تھا کہ کسی نے مجھے زور سے جھنجھوڑا۔ میں بستر پر سے اُٹھا اور کیا دیکھتا ہوں کہ وہی مریض ایک بڑا سا لبادہ پہنے میرے سرہانے کھڑا ہے اور میری طرف ملامت آمیز نگاہوں سے دیکھ رہا ہے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ مرتبانوں کے پاس گیا اور اُن کو بغور دیکھ کر وہاں سے غائب ہو گیا —— مسٹر نیاز! یہ ہے سارا قصہ۔ یہ وہی مریض ہے جو ہر شب اس مکان میں آتا ہے اور یہ وہی انسان نما بھوت ہے جس نے مجھ پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا ہے''۔

یہ تھی ڈاکٹر رُستم خان کی کہانی —— بعض حضرات کے نزدیک یہ واقعہ ناقابلِ یقین اور غیر ممکن ہوگا مگر مجھے ڈاکٹر صاحب کے بیان کی صحت کے متعلق کوئی شک و شبہ نہ تھا —— اب میں نے دِن کا بیشتر حصّہ صرف اسی غور و فکر میں صرف کر دیا کہ کوئی ایسی تدبیر سوچوں جس سے یہ بلا ٹل جائے۔ چنانچہ شام کے وقت ایک نتیجے پر پہنچ کر میں نے اپنے میزبانوں کو یہ کہہ کر حیرت میں ڈال دیا کہ میں دوسری گاڑی سے پُونا جا رہا ہوں۔

''مسٹر نیاز! معلوم ہوتا ہے میں نے اس واقعے کو آپ سے بیان کرنے میں ایک سخت غلطی اور غیر میزبانہ فعل کا ارتکاب کیا ہے —— مجھے چاہیے تھا کہ یہ سب بوجھ اپنے ہی کاندھوں پر رہنے دیتا''۔

''ڈاکٹر صاحب آپ کو غلط فہمی ہو رہی ہے—— میرا گھر واپس جانا اسی واقعے سے تعلق رکھتا ہے۔ میں تو ابھی آپ سے اجازت طلب کرنے والا تھا کہ آج کی رات بھی مجھے اُسی کمرے میں سونے دیا جائے—— میں اس غیر معمولی ملاقاتی کو ایک بار اور دیکھنے کی خواہش رکھتا ہوں''۔

چنانچہ میں وہاں سے رخصت ہو کر سیدھا پونا کے بڑے اسپتال میں گیا۔ جہاں میرا ایک دوست ہاؤس سرجن کے فرائض سرانجام دے رہا تھا۔ میں نے جاتے ہی اُس سے کسی مُردے کا ہاتھ طلب کیا۔ چونکہ اُسے علم تھا کہ میں ہر وقت مختلف اقسام کے تجربوں میں مشغول رہتا ہوں اُس نے بغیر کچھ دریافت کیے مجھے ایک لاوارث مُردے کا ہاتھ کاٹ کر لا دیا جو میڈیکل سکول کے لڑکوں کو عمل جراحی کی تعلیم دینے کی غرض سے اسپتال میں پڑا ہوا تھا۔

جہاں تک میرے مطالعے کا تعلق تھا مجھے اس بات پر یقین تھا کہ وہ شخص اپنا ہاتھ واپس لینے کے لیے بے قرار ہے اور یہی بیقراری اُس کی روح کو آوارہ پھرا رہی ہے۔ اس لیے میں نے خیال کیا کہ شاید کسی دوسرے شخص کا ہاتھ اُس کو مطمئن کر سکے—— یہ محض ایک خیال تھا اور حقیقت یہ ہے کہ مجھے خود اپنے اس خیال پر ہنسی آئی تھی کہ میں ایسی مہمل سعی کر رہا ہوں۔

القصہ میں وہ ہاتھ لے کر ڈاکٹر صاحب کے مکان پر پہنچا اور انہیں اپنے مقصد سے بالکل آگاہ نہ کیا۔

جب میں سونے کے لئے اُس کمرے میں گیا تو میں نے پہلا کام یہ کیا کہ اُس ہاتھ کو ایک مرتبان میں ڈال دیا—— اب وہ ہاتھ قطار والے مرتبانوں میں سے ایک میں پڑا تھا۔ میں اپنی کوشش کا نتیجہ دیکھنے کے لیے اس قدر بے تاب تھا کہ بالکل نہ سو سکا۔ چنانچہ ایک سوفے پر بیٹھ کر میں نہایت بے چینی سے اُس شخص کی آمد کا انتظار کرنے لگا—— وہ آیا، وہی بڑا سا لبادہ پہنے ہوئے پہلی شب کی طرح وہ میرے قریب پہنچ کر ٹھٹکا مگر پھر وہ مرتبانوں کی قطار کی طرف بڑھا۔ اُس کی نگاہیں اُس ہاتھ والے مرتبان کی طرف پڑیں۔ اُس نے مرتبان کو لرزتے ہوئے ہاتھوں سے اُٹھایا اور اٹھاتے ہی غصّے کی حالت میں اُسے زمین پر دے مارا—— مرتبان کے گرتے ہی وہ غائب تھا۔

ابھی ایک منٹ بھی گزرنے نہ پایا ہوگا کہ ڈاکٹر صاحب بھاگتے ہوئے کمرے میں داخل ہوئے اور پوچھا ''خیر تو گزری—— کہیں چوٹ تو نہیں آئی؟''

''نہیں صاحب!—— نا اُمیدی کا سامنا ضرور کرنا پڑا ہے''۔

اب میں نے اُن کو اپنی کوشش اور اُس کے نتیجے کے متعلق سب کچھ سنا دیا۔ انھوں نے میری گفتگو کو نہایت غور سے سنا مگر سر ہلاتے ہوئے بولے'' آپ کی کوشش پُر معنی ضرور تھی مگر میرا خیال ہے ہمیں اس معاملے کو سر دست یہیں چھوڑ دینا چاہیے مبادا کسی مہلک حادثے سے دوچار ہونا پڑے''۔

ڈاکٹر صاحب کے جانے کے بعد صبح تک میں یہی سوچتا رہا کہ میری کوشش ناکام کیوں ثابت ہوئی؟—— بہت غور و فکر کے بعد میں نے زمین پر سے وہ ہاتھ اُٹھایا جو مرتبان کے شکستہ ٹکڑوں کے قریب پڑا ہوا تھا۔ ہاتھ اُٹھاتے ہی میرے دل میں خوشی کی لہر دوڑ گئی—— وہ ہاتھ دایاں تھا اور اُس شخص کا بایاں ہاتھ کٹا ہوا تھا۔

صبح کی پہلی گاڑی میں میں پھر اُسی اسپتال کو گیا اور اپنے دوست سے اُسی لاش کا بایاں ہاتھ کٹوا کر اپنے ساتھ لیتا آیا مگر اب یہ دشواری پیش آئی کہ ڈاکٹر صاحب نے مجھے اُس کمرے میں سونے کی اجازت دینے سے قطعی انکار کر دیا۔

میں نے بہت منت سماجت کی مگر بے سُود۔ چنانچہ میں نے اُس ہاتھ کو پہلی طرح ایک مرتبان میں بند کر کے میز پر رکھ دیا اور آپ ایک دوسرے کمرے میں چلا آیا جو ڈاکٹر صاحب نے میرے سونے کے لیے تیار کرا رکھا تھا۔

بھلا مجھے نیند کس طرح آتی۔ میرا دل تو اُس تجربے کی طرف لگا ہوا تھا۔ رات کے کوئی دو بجے ہوں گے جب ڈاکٹر صاحب شب خوابی کا لباس پہنے بھاگتے ہوئے میرے کمرے میں داخل ہوئے۔ مجھے اُن کی غیر معمولی آمد پر اس قدر تعجب نہ تھا جس قدر اُن کا چہرہ دیکھنے پر ہوا۔ وہ واقعی ایک جوان معلوم ہو رہے تھے۔ آنکھیں چمک رہی تھیں اور وہ اپنا ہاتھ ایک فاتحانہ انداز میں ہلا رہے تھے۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اُنھوں نے چلا کر کہا۔

''ہم کامیاب ہو گئے ہیں—— مسٹر نیاز! میں کن الفاظ میں آپ کا شکریہ ادا کروں''۔

''کیا آپ کا یہ مطلب ہے کہ وہ معاملہ ختم ہو گیا؟—— یعنی وہ شخص راضی ہو گیا''۔

''ہاں! ہاں! اب وہ کبھی نہ آئے گا—— مسٹر نیاز! میں آپ کے اس احسانِ عظیم کا معاوضہ کسی طرح ادا نہیں کر سکتا۔ بتایئے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟—— آپ نے نہ صرف مجھے اُس بلا سے نجات دلائی بلکہ میری بیوی کی جان کو بھی بچا لیا ہے جو اس ہر روز کے حادثے سے اندر ہی اندر گھلی جا رہی تھی—— میں آج سے پہلے ہرگز یقین نہ کر سکتا تھا کہ کوئی انسان مجھے اس مصیبت سے نجات دلا سکے گا''۔

ڈاکٹر صاحب سے پوچھنے پر معلوم ہوا کہ وہ شخص حسبِ معمول رات کو اپنے وقت پر اُن کے پاس آیا۔ اُن کو جھنجھوڑا اور اُس کے بعد اُس کمرے میں چلا گیا جہاں مرتبان پڑے تھے۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ واپس آیا۔ واپسی پر وہ غیر متوقع طور پر بہت خوش معلوم ہوتا ہے۔ وہ اُن کے بستر کے قریب آیا اور تین بار جھک کر سلام کرنے کے بعد غائب ہو گیا۔

ڈاکٹر صاحب فرماتے ہیں کہ جب وہ سلام کرنے کے لیے تیسری بار جھکا تو اُس کا بایاں ہاتھ اپنی جگہ پر موجود تھا۔ چنانچہ یہ ہے وہ خدمت جس سے خوش ہو کر ڈاکٹر صاحب نے مجھے اپنی جائداد کا وارث قرار دیا۔

(ماخوذ از کانن ڈائل)

حوالہ جات

* محمد سعید، اسسٹنٹ پروفیسر، شعبۂ اردو، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی، لاہور۔

منٹو کے متن میں چند جگہوں پر اصلاح کی گئی ہے (مدیر)۔

(۱) سعادت حسن منٹو، ''دست بریدہ بھوت'' ہمایوں (اکتوبر ۱۹۳۵ء): ۷۷۸-۷۷۱۔

(۲) ابوسعید قریشی، منٹو (لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۸ء)، ۴۰۔

کتابیات

منٹو، سعادت حسن۔ ''دست بریدہ بھوت۔'' ہمایوں (اکتوبر ۱۹۳۵ء): ۷۷۸-۷۷۱۔

قریشی، ابوسعید۔ منٹو۔ لاہور: مکتبہ میری لائبریری، ۱۹۸۸ء۔